مجید امجد کی نظم ''افسانے'' کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر فرید احمد

Dr. Fareed Ahmad

Lecturer, Department of Urdu,

Municipal Degree College, Faisalabad.

Abstract:

"This article describes the poetic diction of a renowned poet Majeed Amjad with a critical reference of his remarkable poem "Afsanay". In the above mentioned poem he presents some traditional, historical and romantic characters and tales, wishing to be one of them so that his love tale may also become immortal. His utilization of fascinating similes, striking metaphors and fabrication of appropriate superb words reflect poet's inner feelings, passions and keen observation in a quite masterly way as compared with his predecessor's poetic diction. This poem also possesses a unique quality of eloquence and rhetoric."

جھنگ میں ۲۹ جون ۱۹۱۴ء کو پیدا ہونے والے عبدالمجید امجد کی شاعری اردو کے تمام شعرا سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ قلبی سوز اور مشاہدہ کی بدولت اردو ادب میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہے۔ مجید امجد نے ۱۱ مئی ۱۹۷۴ء میں وفات پائی۔ ان کی شاعری میں زبان و بیان کی تمام تر خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں جس کے لیے کسی زبان کا ادب برسوں آرزوئیں کرتا ہے۔ زیرِ بحث موضوع میں مجید امجد کی جملہ ادبی شعری خصوصیات کی روشنی میں نظم ''افسانے'' کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ نظم کا متن کچھ یوں ہے:

پھر کلی بن کے کوئی ناچتی آہٹ نہ کھلی　　　پھر کوئی بنسی نہ بجی
ریگ زاروں کے تپکتے سے چمکتے سے نشیب　　　منزلِ لیلیٰ کے فریب
قصرِ پرویز کی دہلیز پر روندی ہوئی سِل　　　دل، کسی فرہاد کا دل
اک بھنور، ایک گھڑا، ایک خیالِ محبوب　　　سو دُکھی روحوں کا غروب
برف انبار دیاروں کے کسی پھول کا دھیان　　　پر جلی تتلی کی اُڑان
ہاں یہ جھلسی روایات ہیں، اگنی بھرے خواب　　　دشتِ حقیقت کے سراب
ہاں یہ سب کچھ فقط آرائشِ افسانہ سہی　　　صورت دنیا نہ سہی

پھر بھی سچ پوچھو تو یہ آندھیاں چلتی بھی رہیں مشعلیں جلتی بھی رہیں
کاش میں تیرے سوچوں بھرے نینو میں جلوں اک فسانے میں ڈھلوں (۱)

یہ نظم مجید امجد نے ۳۰ جون ۱۹۵۹ء میں لکھی۔ اس نظم کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ شاعر مختلف عشاق کے واقعات بیان کرتا ہے۔ جن میں ''ہیر رانجھا''، ''لیلیٰ مجنوں''، ''شیریں فرہاد''، ''سسی پنوں'' اور خود مجید امجد کی داستان محبت شامل ہے۔ شاعر کے خیال میں کچھ قصے حقیقی ہوتے ہوئے بھی بعض اوقات خیالی سے محسوس ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مجید امجد انہیں جھلسی ہوئی روایات بھی کہتا ہے۔ حقیقت میں یہ واقعات فرضی ہوں اور ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ بھی ہو، پھر بھی مجید امجد کی خواہش ہے کہ کاش وہ بھی کسی رومانوی قصے یا داستان کا کردار ہوتا! اس کی محبت بھی ایک لازوال قصہ بن جاتی اور اس طرح اس کا نام بھی ان عشاق کی فہرست میں شامل ہو جاتا، جنہوں نے دشت محبت میں اپنے لہو سے وفا کے گل کھلائے اور امر ہو گئے۔ نظم ''افسانے'' کی ہیئت مستزاد ہے۔ مستزاد ایک مکمل مصرعے پر مزید مصرعے یا ٹکڑے کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ مکمل مصرعے اور نصف آپس میں ہم قافیہ بھی ہو سکتے ہیں۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی ''کشاف تنقیدی اصطلاحات'' میں مستزاد کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''مستزاد ہیئت کے اعتبار سے اردو فارسی شاعری کی ایک صنف ہے۔ صورت اس کی یہ ہے کہ غزل یا مسمط یا رباعی کے ہر مصرعے کے آخر میں ایک ٹکڑا اک مخصوص وزن کے مناسبت سے اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ جہاں تک قافیے کا تعلق ہے یہ ٹکڑا اپنے متعلقہ مصرعے کے ساتھ ہم قافیہ بھی ہو سکتا ہے۔ اور یہ ٹکڑے اپنا جداگانہ نظامِ قوافی بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ مستزاد کا رواج پنجابی میں بھی ہے۔ اسے پنجابی میں ڈیوڑھ، ڈیڑھ یا سوایا کہتے ہیں۔'' (۲)

ڈاکٹر سید عامر سہیل اپنی تصنیف ''نقش گرِ ناتمام'' میں مجید امجد کی نظم ''افسانے'' کی ہیئت سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''نظم ''افسانے'' مستزاد ہیئت میں ہے۔ اگرچہ مثلث اور مربع ہیئت میں مجید امجد نے مصرعوں کو مستزاد کے رنگ میں باندھا ہے مگر اس ہیئت کو زیادہ استعمال نہیں کیا۔'' (۳)

مذکورہ بالا نظم کا ہر مصرعہ دو ٹکڑوں پر مشتمل ہے اور یہ دونوں اپنی اپنی جگہ مکمل ہیں۔ پہلے مصرعے کا اختتام لفظ ''کھلی'' پر ہوتا ہے۔ جبکہ ساتھ ہی دوسرے چھوٹے مصرعے کا آخری لفظ ''بجی'' ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر کے دونوں مصرعے ''نشیب'' اور ''فریب'' پر ختم ہوتے ہیں۔ دونوں مصرعے اپنی اپنی جگہ مکمل ہونے کے علاوہ آپس میں ہم قافیہ بھی ہیں۔ اسی طرح نظم کے تمام مصرعے آپس میں ہم قافیہ ہیں۔ مثلاً: ''کھلی اور بجی''، ''نشیب اور فریب''، ''سِل اور دِل''، ''محبوب اور غروب''، ''دھیان اور اڑان''، ''خواب اور سراب''، ''جلوں اور ڈھلوں'' آپس میں ہم قافیہ ہیں۔

نظم کی ابتدا میں شاعر نہایت دلنشیں انداز میں چند مشہور رومانوی قصوں اور ان کے کرداروں کی طرف ایک خوبصورت ترکیب پیدا کرتا ہے آخری مصرعے کو کہنے کے لیے وہ عشاق حضرات کی قربانیوں کو یاد کرتا ہے۔ مثلاً پہلے مصرعے میں ''پھر کوئی بنسی نہ بجی'' سے اشارہ ''ہیر رانجھا'' کے قصے کی طرف ہے۔ وہ رانجھا جس کا اصل نام ''دھیدو'' تھا۔ جو کہ سرگودھا کے علاقے ''تخت ہزارے'' سے جھنگ کے علاقے سیال کی ''ہیر'' کو اپنا دل دے بیٹھتا ہے۔ اس کے والد چوچک کی بھینسیں چراتا ہے۔ ہیر کی کھیڑوں میں شادی کے بعد جوگی بن جاتا ہے اور اسے بھگا لے جاتا ہے۔ آخر جب ہیر کا والد اپنی بدنامی کے ڈر سے ہیر کو زہر دے دیتا ہے تو رانجھا لمبی آہ بھرتا ہے۔ اور اپنی محبوبہ ''ہیر'' کی قبر پر جان کی بازی ہار دیتا ہے۔ مجید امجد کا اشارہ اسی رانجھے کی

داستان محبت کی طرف ہے۔ جو''ہیر'' سے ملاقات سے پہلے اور بعد میں بانسری بجاتا پھرتا تھا۔شاعر کا اشارہ بھی اسی طرف ہے کہ دوبارہ ایسی بانسری کی آواز نہ آئی۔

دوسرے مصرعے میں''منزل لیلیٰ کے فریب'' سے اشارہ لیلیٰ اور مجنوں کی داستان محبت کی طرف ہے۔لیلیٰ جس کا اصل نام''لبنیٰ'' تھا اپنی سیاہی مائل رنگت کی بدولت''لیلیٰ'' کہلاتی تھی۔اس کا عاشق مجنوں جس کا اصل نام''قیس'' تھا لیلیٰ پر جان قربان کرتا تھا۔لیلیٰ کی شادی زبردستی کر دی جاتی ہے۔اس کا شوہر جب اس کی مجنوں کے ساتھ والہانہ محبت محسوس کرتا ہے تو وہ اسے مجنوں کے سپرد کر دیتا ہے۔دونوں دشت میں بھاگتے چلے جاتے ہیں کہ لیلیٰ کے قبیلے والے اس کی پشت میں خنجر گھونپ دیتے ہیں۔مجنوں جب اسے دیکھتا ہے تو شدت غم سے وہ بھی اپنی جان دے دیتا ہے۔مجید امجد کا اشارہ اسی محبت کے لازوال قصے کی طرف ہے۔

اسی نظم کے تیسرے مصرعے میں''قصر پرویز''اور''دل،کسی فرہاد کا دل'' سے اشارہ''شیریں فرہاد'' کی محبت کی طرف ہے۔اس رومانوی داستان کا تعلق عہد نبوتﷺ سے ہے۔نظم میں پرویز سے مراد خسرو پرویز ہے جس نے آپﷺ کا خط مبارک چاک کیا تھا۔شیریں اس کی بیوی تھی جس پر فرہاد عاشق تھا۔خسرو پرویز نے اس کے لیے شرط یہ رکھی کہ''وہ کوہِ بے ستوں'' سے دودھ کی نہر نکال کر لائے تو پھر شیریں کو حاصل کر سکتا ہے۔جب فرہاد اس کا مطالبہ پورا کر دیتا ہے تو خسرو پرویز مکاری سے فرہاد تک یہ پیغام پہنچاتا ہے کہ شیریں زہر کھا کر مر گئی ہے۔فرہاد یہ سن کر وہی تیشہ جس سے وہ پتھر کاٹتا تھا،اپنے سر میں مارتا ہے اور وہیں ڈھیر ہو جاتا ہے۔مجید امجد کا اشارہ اسی عاشق زار کی طرف ہے۔مسعود مفتی''شیریں فرہاد''میں فرہاد کی موت سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''جب اسے مکار عورت شیریں کی موت کا پتہ چلتا ہے تو فرہاد چلایا''ہائے شیریں''اور اس نعرے کے ساتھ ہی اس نے اپنا تیشہ اپنے ماتھے پر دے مارا۔اس کے ماتھے سے خون جاری ہو گیا۔فرہاد نے دوبارہ اسی زخم پر اپنے تیشے کا وار کیا اور پے در پے وار کرتا رہا۔خون کے فوارے ابلتے اور وہ موت کی جانب بڑھتے بڑھتے موت کی آغوش میں جا پہنچا۔''(۴)

اسی نظم کے چوتھے مصرے میں''ایک گھڑا ایک خیالِ محبوب'' سے اشارہ سوہنی مہینوال کے قصے کی طرف ہے۔گھڑے سے مراد وہ گھڑا ہے جس پر تیر کر سوہنی اپنے عاشق مہینوال سے ملنے جایا کرتی تھی۔مہینوال کا نام عزت بیگ تھا جو بلخ کے بہت بڑے سوداگر کا بیٹا تھا۔تجارت کے لیے دہلی آتا ہے۔شاہ جہاں سے ملاقات کرتا ہے۔واپسی پر اس کا گزر گجرات سے ہوتا ہے جو کوزہ گری کے لیے بہت مشہور تھا۔سوہنی کے باپ سے سوہنی کے دیدار کے لیے اس قدر برتن خریدتا چلا جاتا ہے کہ ایک دن کنگال ہو جاتا ہے۔اور سوہنی کے باپ کی بھینسیں چراتا ہے۔اسی وجہ سے اس کا نام مہینوال پڑ جاتا ہے۔سوہنی کی شادی کسی اور سے کر دی جاتی ہے۔مہینوال دریائے چناب کے کنارے ڈیرا جما تا ہے۔جہاں سوہنی ہر شام اسے گھڑے پر تیر کر ملنے آتی تھی۔ایک دن اس کی نند کچا گھڑا رکھ دیتی ہے۔یہ کچا گھڑا دریائے چناب کی موجوں کی نذر ہوتا ہے تو سوہنی مہینوال کو آوازیں دیتی ہے وہ بھی دریا میں اسے بچانے کے لیے کود پڑتا ہے۔اس طرح دونوں دریائے چناب کی موجوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔

مجید امجد''سودکھی روحوں کا غروب'' سے ایسے ہی سیکڑوں ٹوٹے ہوئے دلوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو محبت کے راستے میں موت کو سینے لگا لیتے ہیں۔اس نظم''افسانے'' میں پانچویں مصرے میں آخری داستان محبت کی طرف''برف انبار

دیاروں کے کسی پھول کا دھیان'' جیسے الفاظ سے جو اشارہ ملتا ہے وہ خود شاعر کی محبوبہ شالاط کی طرف ہے جو میونخ، جرمنی سے سیاحت کے لیے آتی ہے تو شاعر کو ہمیشہ کے لیے اپنا گرویدہ بنا کر واپس چلی جاتی ہے۔ یہاں پھول شالاط کی طرف اشارہ ہے جبکہ اسی مصرعے کے دوسرے حصے ''پر جلی تتلی کی اڑان'' سے اشارہ خود شاعر کی ذات کی طرف ہے۔ میونخ سے آنے والی شالاط مجید امجد کی شاعری کا ایک مکمل حصہ بن جاتی ہے۔ جسے شاعر کبھی نہ بھلا پایا۔ ڈاکٹر وزیر آغا اپنے مضمون ''مجید امجد کی داستانِ محبت'' میں یوں لکھتے ہیں:

> ''قدرت نے مجید امجد کی احساساتی اور جذباتی نشو ونما کے لیے یہ موقع بھی مہیا کر دیا اور یہ شالاط کا واپس جرمنی جاتے ہوئے پاکستان میں رکنا۔ ساہیوال (ان دنوں منٹگمری) پہنچنا اور مجید امجد کے دل میں ایک طوفان بن جانا۔''(۵)

مجید امجد شالاط کا ذکر اپنی بہت سی نظموں میں واضح طور پر کرتے ہیں۔ شالاط کے نام ان کے خطوط اور شالاط کے مجید امجد کے نام لکھے گئے خطوط میں واضح طور پر دونوں کے درمیان محبت کے لگاؤ کا واضح ثبوت ایک دوسرے کے نام پیغام کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کا اظہار مجید امجد اپنی نظم ''میونخ'' میں بھی کرتے ہیں۔ شالاط کے نام اپنی نظم ''کوئٹے تک'' میں ان کے جذبات کی ترجمانی ملاحظہ ہو:

صدیوں سے راہ تکتی ہوئی گھاٹیوں میں تم
اک لحہ آ کے ہنس گئے، میں ڈھونڈتا پھرا
ان وادیوں میں برف کے چھینٹوں کیساتھ ساتھ
ہر سُو شرر برس گئے، میں ڈھونڈتا پھرا
راہیں دھوئیں سے بھر گئیں میں منتظر رہا
قرنوں کے رخ جھلس گئے، میں ڈھونڈتا پھرا
تم پھر نہ آ سکو، بتانا تو تھا مجھے
تم دور جا کے بس گئے، میں ڈھونڈتا پھرا(٦)

اگر اس نظم ''افسانے'' کے آخری مصرعے پر غور کیا جائے جس میں شاعر یہ خواہش کرتا ہے کہ کاش میں بھی تیرے سوچوں بھرے نینوں میں جلوں تو تو ہمیں شدید تنہائی اور حسرت کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ تنہائی اور حسرت مجید امجد کے ہاں ہر دوسری تیسری نظم میں کسی نہ کسی رنگ میں مل ہی جاتی ہے۔ اس کی وجہ مجید امجد کی زندگی میں زیادہ مقبولیت کا نہ ہونا اور ناتمام محبت بھی ہے۔ اس کے علاوہ آخری وقت شالاط کا اسے چھوڑ کر جرمنی چلے جانا بھی ہے۔ اسی جملے میں ''پر جلی تتلی'' سے مراد شاعر کی محبت میں بے بسی کی طرف بھی اشارہ ہے۔ شاعر کو خود بھی محبت میں اپنی ناتمام ہمت کا اندازہ ہے کہ وہ کسی طور بھی اپنی محبوبہ تک رسائی حاصل نہ کر پائے گا۔ نتیجہ تنہائی ہے جو شاید خود مجید امجد کی اپنے او پر طاری کردہ ہے یا پھر زندگی میں اسے ناقدری عالم کا سبب بھی قرار دیا جا سکتا ہے کیوں کہ مجید امجد زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی پڑے رہتے، ملازم باہر سے دروازہ لگا جاتا اور شام کو آ کر کھولتا۔ اسی عالم میں ایک دن انہیں بند کمرے میں مردہ پایا گیا۔ شہزاد احمد نے اپنے مضمون ''مجید امجد تنہائی کا مسافر'' میں بھی مجید امجد کو اپنی تنہائی کا خود موردِ الزام ٹھہرایا ہے۔ مجید امجد کو جذبات اور احساسات کی صداقت پر حد درجہ اعتقاد تھا۔ ڈاکٹر افتخار

بیگ اپنی تصنیف ''مجید امجد کی شاعری اور فلسفہ وجودیت'' میں رقمطراز ہیں:

> ''یہ بات طے شدہ ہے کہ مجید امجد کے ہاں ''وجود'' کی بے مثل انفرادیت اور جذبوں پر تیقن کا اظہار جگہ جگہ ملتا ہے۔ دراصل مجید امجد کی نظموں کا مطالعہ اتنی اکہری سطح پر کیا گیا ہے کہ اس کے مفاہیم تک رسائی ہی نہ ہو سکی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اکثر ناقدین نے اسے محض دکھ، غم اور اندوہ کا شاعر گردانہ ہے۔'' (۷)

مجید امجد کی نظم ''افسانے'' کی زبان (Diction) مشاہداتی ہے۔ اور جو الفاظ شاعر استعمال کرتا ہے وہ قلبی تڑپ اور بے چینی کے اظہار کا بہترین نمونہ ہیں۔ اگر ان الفاظ کی جگہ کوئی اور ہم معنی اور ہم وزن الفاظ بھی لائے جائیں تو سطحیت اور مصنوعی پن کی جھلک واضح دکھائی دے گی۔ مثلاً لفظ ''ریگزاروں''، ''تپکتے''، ''روندی''، اور ''اک بھنور'' کی جگہ ہم معانی الفاظ لائے بھی کیوں نہ جائیں لیکن وہ چاشنی پیدا نہیں ہوگی جو اب شاعر ان الفاظ کے استعمال سے پیدا کر چکا ہے۔ اسی طرح دوسری نظموں میں بھی لاتعداد الفاظ ایسے استعمال ہوئے ہیں جو فوراً اپنا تاثر قائم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

نظم ''افسانے'' میں دلکش تراکیب بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ مجید امجد کی شاعری کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے خوبصورت تراکیب اردو ادب کے دامن میں بھر دی ہیں۔ مثلاً ''منزل لیلیٰ کے فریب''، ''قصر پرویز''، ''خیال محبوب''، ''برف انبار دیاروں''، ''پر جلی تتلی''، ''جھلسی روایات''، ''اگنی بھرے خواب''، ''آرائش افسانہ'' اور ''سوچوں بھرے نین'' وغیرہ دل آویز تراکیب ہیں جو شاعر کی اندرونی کیفیات کی بھی عکاس ہیں۔ دورِ جدید میں مجید امجد اس لیے بھی قابل ستائش ہیں کہ انہوں نے تصنع پیدا نہیں ہونے دیا اور زبان کی زرخیزی میں اضافہ کیا ہے۔

نظم ''افسانے'' میں خوبصورت تراکیب کے علاوہ تشبیہہ و استعارات پر بھی نظر ٹھہرتی ہے۔ نظم کے پانچویں مصرعے ''برف انبار دیاروں کے کسی پھول کا دھیان''، ''پر جلی تتلی کی اڑان'' میں لفظ ''پھول'' استعارہ ہے جو شاعر نے اپنے محبوب کے لیے تراشا ہے اور اسی مصرعے کے دوسرے حصے میں ''پر جلی تتلی'' سے اپنی مجبوری اور بے بسی کو نہایت دلنشیں انداز میں پیش کیا ہے۔ اور اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ شاعر کو اپنی بے بسی کا شدید احساس ہے کہ وہ محبوبہ تک رسائی حاصل نہ کر پائے گا۔

اس نظم کی خوبصورتی میں مجید امجد کا رمزیہ انداز بھی کارفرما ہے۔ وہ تمام واقعات کو اس قدر اختصار اور ایجاز (Brevity) سے بیان کر جاتے ہیں کہ جب ان کی نظم میں مذکورہ واقعات کو وضاحت کا جامہ پہنانے کی ضرورت پیش آتی ہے تو شائد سیکڑوں اوراق بھی اس کا احاطہ نہیں کر پاتے۔ مثلاً مذکورہ نظم میں سے اگر چند الفاظ ہی لیے جائیں تو ان پر مکمل کتب بھی لکھی جا سکتی ہیں۔ جیسے ''بنسی''، ''قصر پرویز''، ''ایک گھڑا''، اور ''خیال محبوب''، ''منزل لیلیٰ کے فریب''، ''برف انبار دیاروں'' کا ذکر اور ''پر جلی تتلی کی اڑان''، ایسے وسیع و عریض واقعات ہیں جن پر کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ یہ شاعر کا کمال ہے وہ فصاحت (Eloquence) اور بلاغت (Rhetoric) کے استعمال میں اس قدر طاق ہیں کہ چند الفاظ استعمال کر کے ڈھیروں وضاحت طلب باتیں اس میں سمو دیتے ہیں۔ ان کی بہت سی نظموں اور غزلوں میں یہی خصوصیت قلب و نظر کے عمیق مشاہدے میں ڈھل کر سامنے آتی ہے۔ مثلاً ''بستے رہے سب''، ''بازاروں میں گزرا''، ''سرسر ورکا''، اور ''منزلوں منزلوں روئی''، ''بیٹی ماہ عرب کی'' ان کے ایجاز و اختصار کا منہ بولتا ثبوت ہیں جس میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے بعد ان کے تن مبارک سے جدا کیے ہوئے سر مبارک کی بے حرمتی اور حضرت زینبؓ کی آہ و زاری اور بیچارگی کا منظر چند الفاظ میں پیش کر دیا گیا ہے۔

مجید امجد کی بہت سی نظموں کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ نظمیں اپنے موضوعات سے پہچانی جاتی ہیں۔یعنی جو موضوع نظم کے اوپر ہے وہی تمام نظم میں جاری رہتا ہے اور آخری جملے تک وہ موضوع برقرار رہتا ہے۔مثلاً نظم ''افسانے'' میں تمام افسانوں کا ہی ذکر ہوتا ہے اور آخری مصرعہ بھی اسی لفظ کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔جیسے ''اک فسانے میں ڈھلوں'' اسی طرح ''پنواڑی''، ''کنواں''، ''بستے رہے سب'' اور ''توسیع شہر'' جیسی بے شمار نظمیں اپنے موضوع سے ہی پہچانی جاتی ہیں۔

اس نظم میں علم بیان کی خصوصیت بھی پائی جاتی ہے۔نظم کے آٹھویں مصرعے میں صنعت تضاد کی خوبصورت مثال موجود ہے۔جس میں وہ ایک طرف آندھیوں کے چلنے کا ذکر کرتا ہے تو دوسری طرف وہ چراغ جلانے کی بات کرتا ہے۔جیسے ''سچ پوچھو تو یہ آندھیاں چلتی بھی رہیں، مشعلیں جلتی بھی رہیں'' اس جملے میں ''آندھی'' اور ''مشعل'' صنعت تضاد ہے جو مجید امجد کی اس شدید خواہش کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ہر صورت اپنی محبوبہ شالاط کی محبت کا لازوال کردار بننا چاہتا ہے۔گویا آندھی میں چراغ جلانے کی طرح ہی مشکل ہے۔وہ اپنی محبت کو امر کرنا چاہتا ہے اور ان رومانوی داستانوں کا حصہ بننا چاہتا ہے جو اس سے قبل کے دور سے تعلق رکھتی ہیں۔

مجید امجد کی نظم ''افسانے'' میں زبان و بیان کی بہت سی ادبی خصوصیات موجود ہیں۔اس نظم کا اسلوب مجید امجد کا روایتی اسلوب ہے جو ایجاز و اختصار کی اچھی مثال ہے۔نظم میں ایک ربط پایا جاتا ہے جو شاعر کی قلبی و ذہنی کیفیت کا عکاس ہے۔''افسانے'' کی فضا شاعر کی اپنی محبوبہ سے محبت کی نوعیت کو بھی واضح کرتی ہے اور قاری پر بہت گہرا اثر قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔مجید امجد اپنی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اگر کوئی ان کے کلام کو سمجھنا چاہتا ہے تو پھر وہ اسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھے۔ نظم ''افسانے'' میں دوسری خصوصیات کے ساتھ ساتھ اگر شاعری کی مذکورہ بالا بات کو ملحوظ رکھا جائے تو نظم ''افسانے'' آہستہ آہستہ اپنے تمام مفاہیم قاری پر واضح کرتی جاتی ہے اور یہ بھی حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ جب تک مجید امجد کی شاعری زندہ رہے گی تب تک نظم ''افسانے'' اسی ذوق وشوق سے پڑھی جاتی رہے گی اور مستقبل قریب میں مزید نقادوں کی توجہ کا باعث ہوگی۔

حوالہ جات

۱۔ محمد زکریا، خواجہ، مرتب: کلیات مجید امجد، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص:۳۳۱

۲۔ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، کشاف تنقیدی اصطلاحات، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، ص:۱۷۳

۳۔ عامر سہیل، سید، ڈاکٹر، مجید امجد نقش گرِ ناتمام، لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۰۸ء، ص:۲۷۹

۴۔ مسعود مفتی، شیریں فرہاد، لاہور: سیونتھ سکائی پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء، ص:۲۰۰

۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، مجید امجد کی داستان محبت، مشمولہ: القلم، سہ ماہی، جھنگ: ادبی اکیڈمی جھنگ، بار اول، ۱۹۹۴ء، ص:۱۸۸

۶۔ محمد زکریا، خواجہ، مرتب: کلیات مجید امجد، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص:۳۲۱

۷۔ افتخار بیگ، ڈاکٹر، مجید امجد کی شاعری اور فلسفہ وجودیت، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۰۹ء، ص:۸۹

☆......☆......☆